غیر ممنوعہ نظمیں
انیس ناگی
GEORGES BRAQUE
جارج براق

انیس ناگی

کتابت .... انیس ناگی

تعداد ۲۰۰

سال اشاعت ۱۹۷۳

ناشر و طابع اعجاز الٰہی، الٰہی آرٹ پریس ارسپتال روڈ لاہور

کاپی نمبر ...... ۱۳۱ ......

قیمت .... ۸ روپے

نظمیں

یوسف کامران

دیا ہے۔ جدید شاعری اور بعد میں نئی شاعری اپنی تمام تر جدت کے
باوجود فارمولے کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ اس میں نئے امکانات کی
تلاش ایک اہم ضرورت ہے۔ فرق لسانی اسلوب کا نہیں نقطۂ نظر کا
ہے!

"بشارت کی رات" کے بعد "غیر منوعہ نظمیں" ہمارے معاشرتی
طرز احساس کی وہ بدلتی ہوئی شکل ہے جسے انیس ناگی نے مخصوص
استعاروں کے روپ میں دیکھا ہے۔ موخر الذکر شعری مجموعے کے
طرز احساس کو سمجھنے کے لئے عصری تقاضوں سے واقفیت ضروری ہے
بنیادی طور پر یہ نظمیں سیاسی صورتحال سے پیدا شدہ گھٹن کی
پیداوار ہیں جن میں اس عصر کی بے ہئیت زندگی کے نقشے ملتے ہیں۔
البتہ انیس ناگی نے اس عہد ستم کے واقعات کا ادراک
کرتے ہوئے انہیں سیاسی مفروضوں کی جبریت کا شکار ہونے
نہیں دیا کہ وہ حقیقت کے Dogmatic رویوں کا
قائل نہیں ہے وہ تو صرف جذباتی صورتوں میں استعاراتی عمل
کے ذریعے حقیقتوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ واحد متکلم کا صیغہ تجربات
اور واقعات کو انفرادی سطح پر محسوس کرنے کا ایک اپنا انداز
ہے۔

ذات اور ارد گرد کے ماحول میں معنویت تلاش کرتے ہوئے
انیس ناگی جب معاشرتی نا آسودگی سے پیدا شدہ صورتحال کا جائزہ
لیتا ہے تو عہد کے اس المیے کو نظموں میں سمونے کے لئے شہر
آشوب کی بجائے "وطن آشوب" لکھتا ہے۔ اس کے نزدیک

کون دھواں میں نہائے تغیر کے سب معجزے بے اثر ہو چکے ہیں، شش جہات
کے علوم چراغِ راہ نہیں بن سکے، عصرِ حاضر ثروت کی پرورش
میں متاعِ ہستی لٹا رہا ہے، حقیقتوں کے ظہور کا دن کسی مدار میں
نہیں ہے جو عذابِ مسلسل سے زندگی کو نجات دلا سکے۔ آدمی
کا زوال، تاریخ کی جبریت، نظامِ ثروت کے خلاف احتجاج،
عدمِ تحفظ اور حصولِ رزق کے لئے انا فروشی، اور اس صورتِ حال
سے پیدا شدہ انفرادی اور اجتماعی کرب، اس شعری مجموعے کا
خاصہ ہے، اس مجموعے کی سب سے اہم نظم "میں حرامی نہیں ہوں"
نہ صرف موضوعاتی اعتبار سے ہماری اجتماعی تاریخ کی تعبیرِ نو
ہے بلکہ فنی اور لسانی اعتبار سے نئی شاعری میں منثور شاعری
کے بھرپور اسلوب کے امکانات کی بھی نشاندہی کرتی ہے!
انیس ناگی ان معدودے چند لوگوں میں سے ہے جو نفسانفسی
کے اس دور میں جبکہ اقدار کی شکست و ریخت کی جنگ جاری
ہے، اور ادب پر سے بھی لوگوں کا ایمان اٹھتا جا رہا ہے
وہ ابھی تک تخلیق و مطالعے کو اپنی دیگر مصروفیات کے
ساتھ انتہائی سنجیدگی سے اپنائے ہوئے ہے، وہ تخلیقی صلاحیتوں
کا مالک ایک ایسا باہمت، بلند حوصلہ اور انتھک محنتی آدمی
ہے کہ اپنی تخلیقی سرگرمیوں کے لئے ہمیشہ ایک ہمہ گیر
منصوبہ بندی رکھتا ہے، نظم، تنقید، ڈرامہ، ناول،
ترجمہ، کوئی صنف اور کوئی وظیفہ اس کی دسترس سے باہر
نہیں۔ اس پر بارہا یہ کھلا کہ فائدۂ عرضِ ہنر میں خاک،

نہیں، لیکن وہ تخیل اور مشاہدے کی رو سے جو کچھ سوچتا ہے اس
پر باقاعدہ عمل پیرا ہے!

"غیر ممنوعہ نظمیں" نئی شاعری کے تسلسل میں ایک
سنجیدہ اضافے کی قابلِ تحسین کوشش ہے، اس پر بے راہ روی،
بے معنویت، ابہام اور بے کیفی کا الزام ایک ادبی بد دیانتی
ہوگی! اس کی شاعری کا لب و لہجہ منفرد ہے جو نہ مغربی شعرا
کی نقالی کا نتیجہ ہے اور نہ معاصر شعرا سے اثر پذیری سے پیدا
ہوتا ہے، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انیس ناگی کے رویوں
میں ایک دعویٰ، ایک دھاندلی، تحکم اور مغلوب کرنے کا طریق کار
نظر آتا ہے، یہ ایک غلط فہمی ہے! وہ مصلحتوں، مفاہمتوں،
اور منافقتوں کی آڑ میں نہیں جیتا، لہٰذا اقلیتی زندگی
کے کرب میں زندہ رہ کر جنون، تشدد اور دہشت
کے ذریعے عصرِ حاضر کا رزمیہ مرتب کر رہا ہے!

[illegible]

یوسف کامران

لاہور

جولائی ۱۹۷۳

خاموشی کا شہر

ہوا دھند کے بھیگے مرطوب لب چومتی چیختی ہے:
کہاں زندگی ہے ؟
کہاں زندگی کے نشاں ہیں !
کہ تم شہر میں ہو،
یہاں رات عریاں صداؤں کے پیکر میں ڈھلتی نہیں ہے،
یہاں دن کے پہلو میں راتوں کا زیور، ارادوں
کے گھونگھٹ نہیں ہیں،

یہاں زندگی گھومتا گیند ہے
ایک آسیب ہے !
چلو ان طلسمات سے اب نکل کر
اسی کا بدن ڈھونڈنے جس نے وعدہ کیا تھا،
کہ وہ آخرِ شب اسی شہر میں بھیس اپنا بدل کر
نئی زندگی کے چٹکتے ہوئے پھول تم سے ملے گا۔
چلو، بن سنور کر، وگرنہ
بدن میں اترتی ہوئی خامشی بھوت بن کر
گھروں کے کواڑوں کے پیچھے ڈراتی رہے گی۔

۱۹۶.

حشر کا بلاوا

زمیں تپ گئی، آسماں زرد ہے
آسماں گرم ہے اور زمیں سرخ ہے۔
ابھی حشر کے دن کی دستک اٹھے گی
ذرا ناخنوں سے میرے دل کے نزدیک دستک اٹھی ہے،
وہ دستک جو مجھ میں بھی ہے، اور تجھ میں بھی ہے۔
وہ دستک ـــ
جو اونچی عمارات کے گنبدوں، ریگ زاروں تلک
ہر ایک شئے سے اوجھل، ہر اک پیرہن میں
خموشی کی مانند خاموش ہے ـــ
خموشی سے پھر آج دستک اٹھی ہے
خموشی کی سازش میں دستک ملی ہے ـــ
لکیریں جو شعلوں کے گرداب میں ہیں
لکیریں جنہیں چشمِ خورشید بیروں تلک دیکھتی ہے
لکیریں جو روپ اور بہروپ میں ہیں
اسی ایک دستک سے مدہم
اسی ایک دستک سے روشن ـــ
یہ دستک کا دن ہے،

کہ ساری زمیں جل اٹھی ہے
حرارت سے سارے بدن آگ پالی ہوئے ہیں،
حرارت سے شہروں، بیابان، مدارس، عمارات کی زرد اینٹیں،
خموشی کے جور و ستم سہنے والی
خموشی میں روندی ہوئی صورتیں جل اٹھی ہیں۔

زمیں گرم ہے
حشر بیتے دنوں کا،
وہ دن کیا جو سردی کے موسم میں آئے
وہ دن کیا جو گرمی کے موسم میں آئے
وہ سب دن ملے حشر آنکھوں میں جاگا
یہی دن دنوں میں سے تفریق ہو کر اسی حشر میں آ کے جمع ہوا،
جو اندھیرے اجالے میں اپنے ہی سائے کی مانند ہر گام، ہر سانس کی اوٹ میں خامشی بن کے چلتا رہا ہے۔
بڑھو، آج جاگو!
گھروں کے کواڑوں، مزاروں کے تابوت کھولو
رگوں، ہاتھ پاؤں کی وحشت
لہو کے سہاگ اور سینے کے سیلاب کی الجھنوں کو

اسی آزمائش میں دیکھو
جو اس حشر کے گرم پاتال میں ہے —
وہ پاتال —
اعمال کی آزمائش کا پاتال
جو تجھ میں بھی ہے
اور مجھ میں بھی ہے
سفید اور تاریک رنگوں سے بنتا ہوا
جو ولادت کے دن کی علامت میں ہے!

یہ دن، آج کا دن —
کہ ہر دن ولادت کا دن ہے!
اٹھو تم جو زنجیر میں ہو
اٹھو تم جو جسموں کے تابوت میں جل رہے ہو
اٹھو تم کہ روئے زمیں پر نئی روشنی ہے
مقدر کی تعبیر کا مرحلہ ہے!

۱۹۶۰

مری سرگزشت

مری شکست زندگی نمودِ غم میں ہے،
یہ شش جہات کائنات کے علوم
جذب اور جنوں کے سلسلے
مرے لیے چراغِ راہِ زندگی نہ بن سکے
نہ وارداتِ بہت میں وفا کا وعدہ اور بقا کی
دھوپ بن سکے۔
ہر ایک عہد میں مرے وجود سے فتور کا شگون
جاگتا رہا،

میں چاہتوں کے دیس میں
اور دشمنی کے بھیس میں
اسی کو ڈھونڈتا رہا
جو خود مری تلاش میں مسافروں کے ساتھ تھا۔

سُنا ہے،
آج کل وہ میرے واسطے
سفید برہنہ کمر پہ ایک دبیز سی کتاب لاد کے
صداقتوں کے لفظ ہر جگہ بکھیرتا ہے

اور کبھی توانا تازگی بھرے بدن کی دھوپ میں اسی کے ہاتھ
بجھتا ہے، جو ضعیف ہے۔

اسی سے میرا یہ سوال ہے

میں کون ہوں؟
میں کس زمین سے نکلتا پھول ہوں؟
میں اس زمانے میں رہوں تو کس طرح رہوں؟
تیس سال زندگی کے میرے یوں گذر گئے
کہ جیسے ایک سال ہو!
مگر ابھی تک کسی جواب سے نظر میں راستے کا
در کھلا نہیں
میں ناتمام سرگذشت کا سفال ہاتھ میں لیے
صدی کے موڑ پر اسی کے جسم کی مراقبت
میں ہوں۔

1967

زوال کا خوف

زوال وہ گندگی ہے
جس میں میرے زمانے کی زرد کونپل اُگی ہوئی ہے،
لہو میں ڈوبا وہ آئینہ ہے
شگفتہ صورت کا خوف بن کر
مری ہزیمت کا عکس مجھ کو دکھا رہا ہے۔

مرا زمانہ نظامِ ثروت کی پرورش میں متاعِ ہستی
لُٹا رہا ہے
دماغ اُجڑے بدن پریشاں، کہیں نمو کا نشاں
نہیں ہے،
درخت سارے، خزاں کی پیلی ردا کو اوڑھے
خموشیوں کا سوال بن کر
افق کے پھیلے سمندروں پر شفق کی لالی کے
منتظر ہیں
مگر زمانے کا خوف راتوں کا درد ہے
جو میرے سرہانے رُکا ہوا ہے!

مری مصیبت کو آئینے میں ہوا نے دیکھا
مری رہائی کا درد تھامے
ہوا منڈیروں پہ بال کھولے گلی گلی میں پکارتی ہے:
وہ جلد آئے کہ شانے میرے، چھلے ہوئے ہیں
وہ جلد آئے کہ ساری راتوں میں بھوت اس کا
نشے میں لت پت زمیں کے ماتھے پہ رینگتا ہے!

۱۹۶۷

درخت کی حقیقت

حیات بعد موت کا مجھے پتہ نہیں ہے
جبر کی حقیقتوں کی شکل بے رکاب، منتشر حیات
بے ثبات ہے۔
تمہیں تو یاد ہے
سوادِ شام کی حدود پر کھڑا ہوا درخت چند سال قبل
بے وجود تھا،
ایک دن،
موسمِ بہار میں ہوا چلی
وہ نرم کونپلوں سی کوکھ سے اُچھل کے مشتِ خاک
میں گرا تھا
اس کے جسم کا خمیر موسموں کے ساتھ اس طرح ہرا ہوا
کہ شاخ شاخ برگ و بار سے لدی تھی
رنگ و بو کی کہکشاں زمیں سے آسمان تک سجی تھی۔

موسمِ خزاں میں ایک دن ہوا چلی
تمام برگ و بار اس درخت سے جدا ہوئے

بصورتِ حواس وہ اِدھر اُدھر بکھر گئے
نہ جانے کس جگہ چلے گئے؟
کئی ہزار نقشِ پا تلاش میں نکل گئے،

انتشار کا یہ رازِ بے سراغ، بے چراغ آج تک
رہا ہے
خشک بے نوا درخت جبر کی حقیقتوں کا ضمیر جسم میں لئے
برہنہ، سر بریدہ، اس جگہ حواس باختہ کھڑا یہ
سوچتا ہے:
کیوں، حیات اور موت کا یہ جبر ہر ایک شئے
کے روپ پر محیط ہے؟
یہ مخمصہ درخت کا نہیں
ہر ایک ذی نفس کا ہے
کہ جس کے واسطے حیات کاسۂ سوال ہے؟

۱۹۶۷

وطن آشوب

مرے مہرباں آج کا دن مجھے دے
مرے حرف کے دائرے میں چھپی معنویت سے
باہر نکلتی صدا کو سماعت عطا کر

مجھے حوصلہ دے
کہ اعصاب بکھرے ہوئے ہیں۔
مرا حرف سن!
جانتا ہوں کہ گستاخ لفظوں کی یاداشت میں
ہر بُن مو سے کانٹے نکل کر بدن چھیل دیں گے،
مگر کیا کروں؟
بے بسی کا جنوں مجھ کو تیری حضوری میں لا دیا
کہ دل سے کدورت نکل کر ترا عکس ابھرے
مری رُوح کے سب عزائم تری روح کو
آگہی کا سمندر دکھائیں
کہ میرے جہنم میں سارا جہاں جل رہا ہے!

کبھی میں نے سوچا تھا
میں بھی ہتھیلی پہ جامِ مسرت الٹ کر

نگاہوں میں قوس قزح کی چمک کو سجائے ہوئے
زندگی کی بقا کے لئے
اپنے لوگوں کو ایسے تصور کی دنیا دکھاؤں گا
جس میں سبھی ایک ہو کر نئے عدل کی ایسی بنیاد رکھیں
کہ طبقات کا بھوت دوبارہ اس زندگی کا لہو چاٹنے
کے لئے

پھر کبھی بستیوں سے نہ گزرے۔
مگر میں ترے خوف سے سالہا سال اپنے لبوں کو
مقفل کئے
دم بخود، آنے والے دنوں کو ہر اک رات کے جسم
میں ڈھونڈتا تھا!

مرے مہرباں آشنا!
کھول دے بادباں ہوا
دل مرا تنگ ہے
رات بے تاب ہے
ہر طرف بے یقینی کے محاذ ہیں،
کون عیسیٰ نفس آج بیمار ذہنوں میں جوشِ نمو
کو جگائے؟

نہیں، اب یقیں آ گیا ہے
کہ کون و مکاں میں بنائے تغیر کے سب معجزے
بے اثر ہو چکے ہیں

زندگی آتشِ زیرِ پا کا سلگتا ہوا اک جہنم ہے
جس میں کسی آس کا چاند روشن نہیں ہے
زمیں تنگ ہے
لوگ ہجرت کی خواہش سے بے چین ہیں !

مرے مہرباں شیونِ شاعرِ بے نوا سن :
کبھی رونقِ بزمِ ہستی مرے دم سے تھی
کبھی موسموں کی فضا میں مرے گیت تھے،
میں شب و روز فکرِ سخن کے بھنور میں کھویا ہوا
جبر کے بھوت کے نوحے لکھتا
کہ شاید نجات آدمی کی مساوالی تقسیم میں ہو؟
کبھی میں فلاکت، جہالت سے پیدا شدہ بے دلی
کی بجھارت سمجھاتا
کبھی آرزو کا بدن میں نئے رزمیوں سے سجاتا
کبھی سے وہ آبا دیں
اور میں ایک اجڑے ہوئے راستے کی طرح منزلیں
ڈھونڈتا ہوں !

ایک دن تو نے سوچا
کہ جو سوچتا ہے
وہ سازش میں مصروف ہے گا

ایک دن تو نے میرے حلق میں صدا کو دبا کر کہا:
جاؤ، آزاد ہو
ہر طرح کی سہولت تمہارے لئے ہے!

صدا، جس کے لہجے میں میری تمنا کا ہر نقش تھا
وہ مرے لمس سے دور تیرے تصرف میں سہمی ہوئی تھی
میں صدا کی حقیقت کو اپنے بدن میں چھپائے ہوئے
راستوں پر پریشان تھا،
آخرش ایک دن دوسرے ساحلوں کی زمیں کی کشش نے
مجھے اپنی جانب بلا یا،
کہ یک لخت آئی صدا:
شاعرِ بے نوا تم کدھر جا رہے ہو؟
یہ سچ ہے کہ اس صنعتی عہد میں شاعری ایک بیکار سا مشغلہ ہے
تمدن کے بازار میں اس کا کوئی خریدار ملتا نہیں ہے
مگر ایک دن حرف توقیر پائے گا
اس سر زمیں پر جہاں تم زمانے کے محمل میں زیتون کی شاخ اوڑھے
سفر کی حقیقت کو ظاہر کروگے"

یہ آواز سن کر قدم رُک گئے
اور میں نے کہا:

مہرباں!
صبر اور جبر کی سرد میل سے بدن میرا شل ہو چکا ہے،
مرے لوگ خواجہ سراؤں کی مانند ایام کی بھیلتی اور
سکڑتی رگوں میں

مشالِ لہو رقص میں ہیں،
انہیں زندگی کی تمنا عطا کر
مجھے میری آواز دے —— !
مرے عہد کے لوگ تیری اطاعت کی زنجیر میں
اتنے مایوس ہیں
اتنے خاموش ہیں
آج ان کے لئے زندگی موت ہے!
مہرباں،
اب رگیں صبر سے اس قدر تھک چکی ہیں
مرا فیصلہ خودکشی ہے
کہ مہرِ درخشاں مری زندگی کا مقدر نہیں ہے!

1969

اصحابِ کہف کا ایک ساتھی

سرِ بازار اس نے
ذہن کی پونجی کو نیلامِ عام میں رکھو بہت قیمت لگائی تھی
مگر نیلام گھر میں دور سے آئے ہوئے کچھ کاروباری لوگ
اس کی احمقانہ بے بسی پر ـــــ ،
اس کی احمقانہ بے بسی پر
طفلِ مکتب کی طرح ہنسنے لگے تھے،
اسے حیرت ہوئی
اور وہ زمانے کے تعین میں
کبھی کالی افق پر روشنی کی آخری پھیلی لکیریں
دیکھتا تھا
اور کبھی وہ انگلیوں پر آفرینش سے زمانے
کے گذرتے سال گنتا تھا۔

۱۹۷۳

ایک نئی وبا

آپ تو واقفِ حال ہیں
آپ سے کیا چھپاؤں کہ میں قابلِ رحم ہوں،
ایک ایسی وبا میں گرفتار ہوں
جس سے بدن ہڈیوں کی نمائش پہ مجبور ہے
اور شکم ڈھول بن کر بدن کی حدوں سے بہت
دور جا کر رُکا ہے،
مرا ذہن تشکیک و تشویش کی گود میں بے عملی اور
عدمِ تحفظ سے مغلوب ہے۔

آپ تو جانتے ہیں
آپ سے کیا چھپاؤں
کہ جب ابتلا، ابتری ہو تو پھر اشتہا سے بدن کے خلا میں
زمانے کا سارا خلا ڈوبتا ہے،
یہ میرا خلا ہے
کہ میں رات دن ٹریکٹر سے بیجی ہوئی ساری فصلوں
کو لقمہ بنانے کی خواہش میں دانتوں کے خنجر بہت تیز کر کے
بنی نوعِ انساں کو فاقہ کشی کا جہنم دکھانے پہ مجبور ہوں۔

آپ تو جانتے ہیں
کہ میں لالچی بھی نہیں ہوں
مگر اِس شکم کے خلا ۔۔۔ بُرا مت منائیے یہ
تشبیہ بہت ہی گھسی ہے،
نئے مدعا کے لئے اب حروفِ تہجی کی جدول بدلنی
پڑے گی۔

آپ تو کچھ سمجھ ہی گئے ہیں
شکم میرا گودام ہے،
معتبر ہوں،
ساری فصلوں کی گندم ذخیرے کی صورت میں محفوظ رکھوں گا،
مری اشتہا کی طوالت کا قصہ بہت مختصر ہے
کبھی اس کی تفصیل سے میں تسلی کروں گا!

آپ تو جانتے ہیں
مری جیب میں کچھ کرنسی کے کاغذ مہینے کی محنت کی صورت
میں بکھرے ہوئے ہیں
میں کرنسی کے کاغذ لئے
اشتہا اک الاؤ، زمان و مکاں کی حدوں میں سلگتا ہوا
ناف در ناف جلتا ہوا
کس طرح اب بجھاؤں
کہ میری معیشت "سکیلوں" کی محتاج ہے ــــ!

کبھی سوچتا ہوں
کہ میں اشتہا کا گلہ گھونٹ کر
وہ مقامِ نفس ڈھونڈ لوں
صوفیوں، رشیوں اور پرہیزگاروں نے جس کے لئے
اپنی خوراک کی آنت ختنہ کرائی؟
مگر آپ جانتے ہیں
کہ اک پیر کی اشتہا سے
جنوں سارے اعصاب پر ناچتا ہے
جہاں من و تو کے ذرات بھی ناچتے ہیں
بس مجبور ہوں!

آج روشن ہوا ہے
یہی رزق اس بھوت نے بے مزہ کر دیا ہے
کہ جس کی بتیسی میں بائیس کیرٹ کے سونے نے
گندم کے دانوں کو یوں کھوکھلا کر دیا ہے
کہ کھاتے ہی جس سے نئی اشتہا کا الاؤ
نئے صنعتی ذہن اپنی زنجیر میں لے چکا ہے۔
یہ جلتے ہوئے شہرِ بے اطمینانی، ہوس میں ابلتے تمدن کی تصویر ہیں
زندگی اس کے ہاتھوں پریشان ہے؟
آؤ، اس اشتہا کو بجھائیں

مگر اس قدر آب و دانہ کہاں سے منگائیں
آپ کی وہ نصیحت مجھے یاد ہے:
فاتر العقل!

یہ دور مادہ پرستی کا ہے
اس تمدن کی پستی کا ہے،
اشتہا کے پجاری ذرا ناخن ہوش لے
اس کشادہ زمیں پر بلورِ بجلی میں پارہ صفت
خوبروں کے عریاں بدن کی ملاحت میں اک آرزو
کا جہاں ہے:

اسے دیکھ،
آدم نے اس کے لئے وہ بہشت بریں چھوڑ دی تھی
کہ جس کے لئے آج کے ناصح منبروں پر پریشان ہیں!

فاتر العقل ہوں
آرزو کا جہاں میری آنکھوں میں بستا نہیں ہے
کہ بچپن گھرانے گلی کوچوں کی خاک میں پرورش پائی ہے
اس لئے نعمتیں دیکھ کر میں شرافت کی تعلیم سے منحرف ہو کے
اک دم جھپٹتا ہوں، جیسے ازل سے مری اشتہا کا جہنم

سلگتا رہا ہے۔

بلاشک،
مرے واسطے کام ہی کام ہے
کام سے ہاتھ کی سب لکیریں اسی نقشِ باطل کی مانند
مٹ کر فنا ہو چکی ہیں
جسے میری، لوحِ بدن پر کسی نے لکھا تھا!
مجھے بھی یقیں ہے
کہ ہر کام میں برتری ہے
مگر آپ بھی جانتے ہیں
کہ بیگار کے کام میں اشتہا کا الاؤ
زمیں سے بھڑک کر خلائے آسماں چاٹتا ہے!

مجھے آپ کچھ تو بتائیں
کہ کیوں آپ نے اشتہا کو فروغِ مسلسل دیا ہے
کہ میں اس شکم میں تگ گرم چکی۔۔۔۔
چھوڑیئے، فاترالعقل ہوں
اشتہا فلسفہ زندگی کا نہیں ہے؟
کبھی ہم اسے طے کریں گے
ملاقات ہوتی رہے گی!

۱۹۷۰

بینا بحران

اس سمندر کی ہواؤں پہ مرا نام نہیں ہے
اس چمکتے ہوئے صحرا کے بگولوں پہ مرا نام نہیں ہے،
ڈھونڈنے والے مجھے ڈھونڈ کسی اور جہاں میں
میں مقاماتِ بدن چھوڑ کے مہرِ ازل تاب کی تحریر بنا ہوں
میں تنفس کے سمندر سے بہت دور کرۂ آدم خاکی
کی تجارت کا تماشا
دیکھتا ہوں کہ بنی نوع حصولِ زرِ ناقص کے لئے کیسے پراگندہ
ہوئی ہے:
قتل و غارت کا سماں اور صداؤں کی تجارت کے جرائم
عالمِ بہت پہ غلبے کے پسِ پردہ وسائل
عصرِ حاضر کے اسالیب نئی شوخ شرافت کے کھلے
در ہیں،
اجازت کی ضرورت ہی نہیں
آؤ چلے آؤ
کوئی پوچھے تو یہ کہنا:
لفظ و سیلہ ہیں تجارت کا کوئی شر نہیں ہے
کون کہتا ہے کہ اعلانِ صدا شرط وفا ہے۔

عصرِ حاضر کی صدا سے یہ مقاماتِ بدن ٹوٹ گئے
کتنا پریشان ہوا سوچتا ہوں:
بندہ بشر آج ہلاکت کی لئے تیغ تمول کے نشے میں
اپنی ہلاکت کے لئے جان بکف ہے!
کیسے دیوانہ ہوا بندہ بشر کون بتائے
میں تو اب مہرِ ازل تاب کی تجرید بنا آدمِ خاکی
کے مقدر کی خبر لینے چلا ہوں

1969

مجرمانہ حملہ

سارے دن کے سفر سے تھکا ہوا خورشید افق کا سرخ
لبادہ پہنے دور ہی دور پھسلتا جاتا ہے،
اور رات عظیم برہنہ عورت کی مانند بدن پھیلاتے پھیلاتے
شہروں سے شہروں تک پھیلتی جاتی ہے،
تاریک اُجالے میں شعلوں کے مکروں تصور گم ہو جاتے ہیں
تاریک اجالا برکت ہے
تاریک اُجالا ایک پناہ ہے
جس کی موٹی چادر میں لوگ جرائم اور شہوت کی غنائی
سے احساس مروت کا منہ کالا کرتے ہیں،
اپنے آپ سے باہر آتے ہیں؛
ٹیڑھے دانتوں والے دلال گلی کوچوں میں گرم
ہوس کی آواز لگاتے ہیں،
سڑکوں پر تاجر پیشہ اور دفاتر کے بابو چڑھتے
بھاؤ اور ماتحتی کے غم کی سوچ بدن میں لے کر گھر جاتے ہیں،
کھلی چھتوں پر کووں کے سایے مدہم ہوتے جاتے ہیں۔
شاعر رات نگاہوں میں تھامے منحوس ہواؤں کا
متلاشی ہے

جو صبح سویرے مخت زمانہ بن کر اس کی رگیں پھلدتی ہیں۔
دن منحوس صداؤں کا بھر پور سمندر ہے
اور تشدد اس کی نس نس میں ہے،
رات صداؤں سے بنتی شکلوں کا مسکن ہے،
شکلوں کے بے چین حباب تنفس کے گرم سمندر پر رقصاں
رات کی جانب بڑھتے ہیں
اور رات شکستہ عصمت کا پھٹا لباس اٹھائے دور
کہیں جا چھپتی ہے،
اور صبح کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی!

۱۹۷۰

دیکھنے کی خواہش میں جینا

مرے واسطے زندگی میں فقط دیکھنے کے سوا اور
کوئی حقیقت نہیں ہے
اسی واسطے صبح سے شام تک دیکھتا ہوں کہ
تجارت گھروں، کارخانوں، سکولوں میں ہاتھ اور لب
آزمائش کے بندھن میں جکڑے ہوئے ہیں۔
کوئی آج دیکھے تو اتنا کہے گا:
طلب اور خواہش کے کپڑے نئے ہیں
پرانے مکاں کی حیادار بی بی کی نوعمر بیٹی
نئے چست کپڑے بنانے کی خواہش میں روٹھی ہوئی ہے۔

مرے واسطے اس تماشے میں کوئی بھی لذت نہیں ہے
کہ بیمار ہوں اور زباں ذائقہ کھو چکی ہے،
کئی دن سے اخبار بھی بے مزہ ہے۔
فقط دیکھتا ہوں
اسے ڈھونڈتا ہوں
جو ہے اور نہیں ہے!

۱۹۶۴

ایک نئی خواہش

گنبدِ بے در کا در کھولو کہ ہم
عصرِ رواں کے ڈوبتے دن میں زوالِ آدمی کا
پھیلتا سایہ
زمین و آسماں کے درمیاں دیکھیں
کہ وہ جبر قوتِ شمشیر ہاتھوں میں لئے اعلان کرتا ہے:
کہ میں ہی منتہائے آفرینش !
انفس و آفاق کے سب شعبدے مرہون میری ذات
کے ہیں ۔

قوتِ شمشیر ہوں
اور میری قوتِ تسخیر سے ہر ذہن کے خلوت کدے میں
گہری اطاعت کا چمکتا راز ہے ۔
کمزور جسموں کے لئے میں بن بلائی موت ہوں،
میں قوتِ تسخیر ہوں
میرے لہو سے ہر زمانے کا چمن آباد ہے،
اس گفتگو سے کہکشاں کی روشنی میں بابِ عبرت وا ہوا:
اب گردشِ ایام بوجہل آدمی کے واسطے ہے
بادشاہوں سے فقیروں کے بدلتے روپ میں

ہر زاویے میں رات ہے
اور بے سمتی کا روگ ہے؛
تسخیر میں تخریب ہے
ان ر کشتی کی رسم کی تجدید ہے!

تم بے خبر ہو
کچھ جانتے ہو آدمی کی شکل کیسے ڈھل گئی ہے؟
تابری کے شوق میں تصویر کیسے جل گئی ہے؟
چھوڑو قصہ عظمتوں کا!
گنبدِ بے در میں پھر اس عہد نامے کی عبارت کو جگا
جو نسلِ آدم نے کبھی تحریر کی تھی
جو وفائے آدمیت سے بھری تھی
گود جس کی نیک وعدوں سے لدی تھی،
شام کی محراب لالہ زار جس کے رنگ سے ہے۔
نسلِ آدم چھوڑ دے تسخیر کی وہ سلطنت ——
شدّاد کی فردوس جس میں بے کلی کا روگ ہے۔

ڈھونڈو ایسے نظامِ زندگی کو
جو بنائے عدل کی تعمیر ہو!
ڈھونڈ شہروں اور پہاڑوں، فلسفے کی سب کتابوں
ذہن کے ان مرغزاروں میں

جہاں اب روشنی اور تیرگی میں ایک مبہم جنگ ہے۔

عصرِ رواں اب جا رہا ہے
روک لو روکو
گنبدِ بے در کا در کھولو کہ یہ بھر
ہرگز نہ بخشے گا زمانہ جو ہماری زندگی ہے
موت کا پیغام ہے۔

۱۹۶۹

درِ زندگی کہاں ہے؟

میں آشنا ہوں نقیبِ شب کا
میں راز داں ہوں فرازِ دن کا
میں جانتا ہوں کہ آگہی کا عذاب کیا ہے۔
یہ آج نصف النہار پر جو ہوا رکی ہے
گلی گلی میں نقیبِ حرمان و بے دلی ہے:
کہ آزمائش کے دن ابھی ہیں
بدن تشنج کے روگ سے کب نجات پائے گا،

اے زمیں،
اب گھروں کے آنگن میں عورتوں نے بھی چارپائیاں
الٹ کے بالوں میں راکھ ڈالی ہے،
نیم شب بستروں کی سلوٹ سے تنگ آکر
اداس آنکھوں سے بام و در پر دلوں کی دھڑکن کے
ڈھول سنتیں
نحیف ہاتھوں سے آسماں کی چادر ٹٹولتی ہیں
کہ کھیتیوں میں ہری بہاروں کی تازگی سے
کبھی شقاوت کی تیرگی کا طلسم ٹوٹے گا

اے زمیں،

اب نجات کیسے ملے گی
عمرِ عزیز کو کوئی بقا کا وعدہ بھی نہیں ہے۔
کہاں تلک ہم یونہی جیئں گے؟
نسیں رطوبت سے خشک ہو کر ابھر گئی ہیں
کہ خشک سالی کے دن ابھی ہیں۔

کئی دنوں سے میں بند کمرے کی اوٹ میں اپنی صداؤں کو
سُن رہا ہوں،
کئی دنوں سے میں دکھ کے برزخ میں جل رہا ہوں
جہاں تعطل کا ایک لمحہ بدن شکن ہے۔
میں دیکھتا ہوں،
گلی صداؤں سے بھر گئی ہے
یہی صدائیں گلی سے باہر دلوں کے اندر سما رہی ہیں!

مری طرف سے یہ راز سب پر عیاں کرو تم
کہ آدمی آج آزمائش کا مرحلہ ہے؛
یہ راز سب پر عیاں کرو تم
کہ عصرِ حاضر میں جبر سے جبر کی بقا ہے۔

کئی دنوں سے یہی صدائیں میں سُن رہا ہوں
نجاتِ آدم نظامِ نو کا شجر ہے

جس پر حقوقِ تازہ کے نرم پتے
جہادِ پیہم سے فصلِ گل میں بحال ہونگے!

عروسِ ہستی فقط وہی ہے
کہ جس کی چاہت سے سارے جسموں میں چاندنی کا غبار
جا گے۔
میں جانتا ہوں یہ ساعتیں اب زوال کی ہیں
میں جانتا ہوں کہ زرگری کے بخار سے اب
دماغ سب کا بکھر گیا ہے
میں جانتا ہوں فراغِ آدم کہیں نہیں ہے
نظامِ کہنہ، حیاتِ تازہ، نظامِ تازہ، حیاتِ کہنہ
نظام زر کے وہ سلسلے ہیں
جو زندگی کو
نجاتِ آدم کی شاخِ زریں بنا کے آنکھوں کو لوٹتے ہیں۔
فراغِ آدم کہیں نہیں ہے
کہیں بھی کوئی
نجاتِ ہستی کا گرم روزن کھلا نہیں ہے!

۱۹۶۹

سعیِ رائیگاں کا سفر

یہی سُنا تھا
حقیقتوں کے ظہور کا دن مدار میں ہے،
تلاشِ پیہم کا آس وسیلہ میں لے کے سوئے فلک گیا تھا
کہ آفتابِ حیات پرور سے میں بھی پوچھوں:
تری ضیا سے فضا منور
تو زندگی کا ہی راز داں ہے
بتا، وہ دن جو نجات کا ہے
کہ جس کا وعدہ کتاب میں ہے
وہ کس فضا میں چھپا ہوا ہے۔
یہ بات سنتے ہی آفتابِ حیات پرور نے ایک
کروٹ سے میری آنکھوں کو خیرہ کر کے
کہا کہ جاؤ، فضا میں ڈھونڈو
وہ دن جو تیرے حساب میں ہے!

میں ظلمتِ شب میں بلا تکلف اتر گیا تھا
کہ تیرگی میں اسی کو ڈھونڈوں کہ جس کا وعدہ
کتاب میں ہے۔

مگر فضا میں کہیں بھی مجھ کو نظر نہ آئی وہ روشنی جو
عذابِ پیہم سے زندگی کو نجات دے گی
فنا کی یورش سے آدمی کو بچا کے ہستی کا راز دے گی۔

خلد نوردی کے بعد میں اس زمیں کی ساری مسافتوں پر
بکھر گیا تھا
کہ برگ و بر سے، بشر بشر سے، یہ میں بھی پوچھوں:
تمہارے شہروں کی روشنی میں
وہ دن کہاں ہے؟
کہ جس کا وعدہ کتاب میں ہے۔

تلاشِ پیہم صدا بجا تھی
پھر بھی میں نے نفس کے سارے مدار دیکھے
مگر حقیقتوں کے ظہور کا دن کسی فضا میں نظر
نہ آیا،
نجات کا در میں بند کر کے
زمیں پہ پھیلی مشقتوں میں بکھر گیا ہوں!

1969

دورانِ سر

میں کمزور ہوں
اور میرا ربط ٹوٹا ہوا ہے،
زمیں بے شجر ہے، ہجومِ زن و مرد ہے
خشک پتے کی مانند ہر راہ پر میں پریشان ہوں
ہر طرف جھنجھناتی صداؤں میں اوسان ایسے خطا ہیں
کہ الجھتا ہوا ایک الجھاؤ ہے
جو سلجھتا نہیں ہے۔
میرے واسطے زندگی ایک دورانِ سر ہے
نہ سر ہے نہ پاؤں!

میں کمزور ہوں
اور ہر اک سوچ کو خواب کی گود میں بھیجتا ہوں
کہ صبح سویرے نئی فصل کی چھاؤں میں آنے والے
زمانے کا قصہ سنوں گا۔
میں کمزور ہوں
اور فقط سوچتا ہوں
کہ میں زندگی کی دلہن

خواہشوں کے بدن کو کہاں پاؤں گا
زندگی مختصر ہے!
مرے پاس ابہام کی الجھنوں کے سوا کچھ نہیں ہے،
کبھی سوچتا ہوں
کہ زر کی چمک سے بدن کو سجاؤں
اسی طرح شہرت کی شادی رچاؤں
کہ سب لوگ تعظیم کا دکھ اٹھائیں،
یہ اعزاز سینے کی سلوٹ میں ٹانکے اکڑ کر چلوں
اور تاریخ کے باب میرے شکوہ سے لرزنے لگیں!
صبح روشن ہوئی، میں تو کمزور ہوں
اور اس کے نقشِ قدم ڈھونڈتا ہوں
جو خود شہر میں تو نہیں ہے
مگر جس کے نقشِ قدم پختہ سڑکوں پہ پھیلے ہوئے ہیں؛
کسی نے بتایا ہے مجھ کو
وہ شخص خزانے کی خواہش میں چوری چھپے رات
کے آخری پہر رخصت ہوا تھا
ابھی تک وہ آیا نہیں ہے
مرے واسطے کچھ بھی لایا نہیں ہے!

میں کمزور ہوں
پر میری گواہی مضبوط ہے

آج اس کی رگیں ساری خالی کروں گا
کہ اس نے مجھے خوف اور بے یقینی، رقابت کے سمات
میں کا پہننے کا سلیقہ سکھایا
مرا ربط توڑا ہر اک شئے سے توڑا
میں لوگوں میں رہ کے بھی تنہا رہا ہوں!

یہ دورانِ سر، الجھنیں اور میں
سر پہ پھیلی ہوئی رات کی تیرگی میں یہی آرزو ہے
کہ عصرِ رواں کے مسیحا کی آنکھیں کھلیں
جو مری نبض پر انگلیاں رکھ کے کہہ دے:
زندگی پاک ہے، صاف ہے
اور دورانِ سر تو تصادم کا احساس ہے
جو سکونت کی خاطر دماغوں کے مسکن ہر اک عصر
میں ڈھونڈتا ہے!

۱۹۷۰

ایک بھیانک کشف

میری زندگی بھی عجب مخمصہ ہے
کہ شام و سحر قرصِ نانِ جویں کے جلے حاشیوں کے
طوافِ مسلسل سے میں عالمِ وجد میں ہوں؛
ترفع کے احساس میں ذہن شفاف چاندی کی
مانند ہر عکس محفوظ رکھتا ہے،
پچھلے پہر رات کو عالمِ کشف میں
میں نے ساری فضا کو ستاروں کے اسرار سے گفتگو
کے مراحل میں دیکھا
مگر چاند، حیرت ہوئی، کچھ پریشان تھا
آسماں کے توے پر وہ کچا سا نانِ جویں تھا
جسے کوری مٹی کے چٹلے کی بڑھتی ہوئی اشتہا
کے لئے
روشنی نے ابھی تک پکایا نہیں تھا۔
اسے دیکھتے ہی میں وجدان کی روشنی میں لرزتے
ہوئے
روح کے سارے بھات کی سلطنت سے نکل کر
فلک کی طرف ہاتھ اونچے کیے

آگے بڑھنے لگا تھا
کہ آں اسرافیلی صدا سے قدم رُک گئے تھے
اور چاند کالی فضا کے مداروں میں گم ہو گیا تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے میں عالمِ ہوش کی گرد دہلیز پر
کشف کا ٹوٹا کاسہ لئے،
سر جھکائے ہوئے پوچھتا تھا:
مرے واسطے زندگی کیوں پریشان ہے؟
اختلالِ دل و جان ہے؟
کشف میرے لئے اور کوئی نہیں ہے؟

بدگماں میں نہیں ہوں
مگر کون ہے، وہ
کہ جس نے مجھے اشتہا کا پجاری بنایا
ہر اک کشف میں اپنا چہرہ دکھایا
کہ میں سوچ کی سلطنت سے نکل کر
فقط اشتہا کے جہنم کے آزار میں تا قیامت
سلگتا رہوں!

۱۹۷۱

آگ بجھ گئی ہے

وہ آگ جو زرتشت کے پہلو میں تھی
وہ آگ جو خورشید کی مشعل میں تھی
وہ آگ جو زندان کے ہر طاقچے کا نور تھی
وہ آگ جو بے بس دیاروں کی پریشاں دلہنوں
کی دھڑکنوں کا پھول تھی
وہ آگ میرے دل میں اس کے سانس سے
کیوں بجھ گئی ہے ؟

۱۹۷۲

رات میں ایک سرسامی کیفیت

رات سناٹا نہیں تھا،
خامشی کے حاملہ نقشِ قدم دن کی ابھرتی
تیرگی میں
ڈوبتی دہلیز تک پھیلے ہوئے تھے،
دور مجھ سے دور!
میں کالے سمندر رات کے ساحل پہ ان بے صوت
لفظوں کے ہیولے ڈھونڈتا تھا
جو برہنہ دستکوں کا شور بن کر ذہن کو محشر
بناتے ہیں،
کبھی سایہ بنے، چپ چاپ احساس کی دھڑکن جگاتے
ہیں،
کبھی مصروف دن میں کام کرتے، کام کرتے ہاتھ
کو یوں روکتے ہیں
جیسے کوئی یاد آئے
اور طبیعت کے خلل سے جسم میں اک بے کلی کی
لہر دوڑے!
ایک ایسی ہی صدا

ہر روز میرے شل ہوئے اعصاب کو چھوتی ہوئی
مجھ کو مضطرب کرتی ہوئی
آپ نغمگی کی صوت کا جادو جگاتی ہے!
کشمکش کا یہ سفر مجھ کو صداؤں سے بنی تصویر کے
اس چوکھٹے سے کھینچ کر
پھر رات کا ساحل دکھاتا ہے
جہاں میں اِس صدا کو ڈھونڈتا ہوں
جو ہیولے کی صدا ہے
جو زمانے کے جلو میں سب زمانوں کی صدا ہے
جو حدوں کو توڑ کر رات کے ساحل پہ نازل ہو
رہی ہے!
آفرینش کی نئی تعبیر کو اب کون سمجھے، کون بوجھے؟
یہ بجھارت رات کا سناٹا ہے!

۱۹۷۲

مہذب شہر میں ننگا مسافر

میں اس دوزخی شہر کی الجھنوں میں
گھروں سے نکلتے تمدن کے سب راستے بھول کر
ایک ایسی ڈگر پر چلا ہوں
کہ چلتے ہوئے اپنے سائے سے ننگا بدن ڈھانپنے
کی ضرورت نہیں ہے
کہ اس شہر کے سب ستر پوش لوگوں سے میری
ملاقات ہے!

۱۹۷۳

احساس کے افق کا ایک منظر

جوانی میں بڑھاپے کا مسافر ہوں
اگر کوئی بدن آئے نظر مجھ کو بھی — کبھی
نسیں چبھتی نہیں ہیں۔
اگر پیچھے سے آئے صدا کوئی
تو دھڑکن کا تماشا مضطرب کرتا نہیں ہے نہ
نہ گذرے وقت کی دہشت ڈراتی ہے
نہ اندھی سی بصارت آنے والے وقت کی
چشم تصور میں
نئی منزل کے خوابوں، وادیوں، شہروں کی
بنیادیں اٹھاتی ہے!

طبیعت میں خلا ہے
ذہن خالی غار کی مانند حیرت سے کھُلا
چھونے کے شہروں پہ تنے آکاش پر روشن ستاروں کے
سکوت اور خامشی کے پھیلتے ابہام میں کھویا
ہوا احساس ہے!

۱۹۷۳

خالی ذہن کی سوچ

وہ دن سپنے کی دُلہن
رات کی تیز کٹار پہ ننگی ناچے،
ناچ ہو کر رنگ دکھائے
اور بدن پر خوف کی چادر چھائے؛
دن سپنے کی دُلہن رنگوں اور وہموں کی دھڑکن میں
اپنا آپ دکھائے۔
کبھی جمائی کے گہرے خلا میں
دونوں زانوں گر جائے،
اور اِدھر اُدھر کی آوازوں میں
سارا وجود اک سایے میں ڈھل جائے!

۱۹۷۴

شور ہی شور ہے

ہر طرف شور ہی شور ہے
اپنی آواز کیسے سُنوں، دوسروں کو سناؤں
کہ گوشِ سماعت سے میرے لبوں تک
فقط شور ہی شور ہے،
جو آواز کی معنویت سے عاری
دماغوں میں ہل چل مچاتا ہوا
ہر نئے شہر میں صبح سے شام تک
پھیلتا پھیلتا
دھول کے شامیانے کی مانند چھایا ہوا ہے!
مرے شہر کے لوگ بھی خوب ہیں
جو سدا شور کے خول میں زندگی کی بھیانک لذت
میں اعضا کو ڈھیلا کئے جی رہے ہیں۔
شور ان کے لئے رزق ہے
شور ان کے لئے راحتِ جان ہے
شور میں زندگی کی تمنا انہیں موت کے خوف سے
کاہشِ فکر سے
اس پرندے کی مانند آزاد رکھتی ہے

جو آسماں کی فضا میں شکاری پرندے کی عمبی
اڑانوں سے محفوظ پرواز میں ہے

ہر طرف شور ہی شور ہے
تیز چلتے ہوئے ہر قدم کا
دھڑکتے ہوئے ہر قدم کا
دلوں سے، مشینوں سے پہیوں سے باہر نکلتے
ہوئے شور سے
مضطرب ہوں۔
کہیں میری آواز کا نقش ملتا نہیں ہے،
میں گم گشتہ آواز کی جستجو میں رواں
زندگی کے مدارج سے ہوتا ہوا
عہد حاضر کی دہلیز پر اپنے اعلان کا منتظر ہوں!

۱۹۷۳

رات کی حد سے باہر ملاقات

آج مجھے تم رات سے باہر آکر ملنا،
کسی مکاں کی قید نہیں ہے
کسی زماں کی شرط نہیں ہے
احساس کے حدود حیز کی دھڑکن پہ دبے
پاؤں اترنا کہ وہاں ہیئت یک لخت شکستہ ہو جاتی
ہے۔
اور تمہارے جسم کا لمس میرے احساس سے یوں
کٹ جاتا ہے جیسے جھاگ میں کچی مٹی کا ساحل گرتا ہو۔
مجھے حدوں سے باہر ملنا کہ حدوں کی قید سے
خائف ہوں ، میری پسلی میں ساری خلقت، تاریک
ستاروں اور منور کروں کے وہ راز چھپے ہیں جو
گرداب کی مانند حقیقت کا جال بناتے ہیں ، جن کی
کھوج میں کاوش کا شیشہ پگھل پگھل کے پانی
ہوا ہے۔
مجھ کو اپنی خواہش سے باہر آکر ملنا ، میری
ملاقات تمہارے ازلی دشمن جبر اور موت کو اپنے
زنداں میں ڈالے گی ۔

اور تم زندہ رہنے کے خدشات سے اٹھتے صدمات
پر قابو پا کر اپنے آپ پہ قادر ہو جاؤ گے،
پھر وہ لمحہ آئے گا جب تم اپنی ذات سے باہر آتے
نور کا ہالہ پہنے روندے انسانوں کو، ایسے انسانوں
کو جو اپنے احساس کی لو بھی تمہارے سفاک زمانوں
میں تکمیل کی خاطر دکھ کھاتے ہیں، نئی راحت کا خواب
دکھانا!

میرے پاس تم کورے کاغذ کی مانند سفید وجود
کی دھن لانا جس میں ہستی کا جادو تازہ تازہ
اترا ہو۔

حیرت ہے تم ابھی تک رات کے اندر، صبح کی خاطر
دور افق پر گرتے تاروں کے منظر میں گم، مجھ
سے غافل ہو،
اس غفلت کا خمیازہ: اپنے آپ کو کھونا، خلقت
کے لشکر میں گم ہو جانا، اور کبھی پھر ہاتھ نہ آنا ہے!
تم مجھ کو ڈھونڈو گے، پھر میری یاد تمہارے
نابینا پن میں بینائی کی حسرت بن جائے گی!

۱۹۷۳

میں حرامی نہیں ہوں

آج کی رات میرے اعصاب پہ بھاری ہے۔
میں تاریخ کے ششوں، لفظوں کی ڈھالوں
اور الغوں کے نیزوں پہ ننگے پاؤں اپنے اجداد
کی کھوج میں نکلا ہوں۔
مجھے زمانے کے صحراؤں، دروں اور پہاڑوں سے
ان رستوں پہ جانا ہے جن کی کٹی پھٹی پتھریلی نوکوں
پہ میرے اجداد اونٹوں، گھوڑوں اور سانڈھوں پر
رخت سفر باندھے، گاتے، بہ جھنتے، آگے بڑھتے،
پنجاب کے وسطی میدانوں کی ڈھلوانوں پر، سورج
کی تندی میں تلواریں چمکاتے، آئے تھے، فتح کی
خاطر، رزق کمانے، اور نسل بڑھانے ___
اور وہ پانچ دہانوں سے باہر آتے دریاؤں
کے ساتھ پرندوں کے غولوں کی مانند کناروں کو
چھوتے قریہ قریہ پھیل گئے تھے، نئی زمین کی
لذت اور خواہش کی اونچی چھانوں سے دور سنہری
کھیتوں میں اگتی فصلوں کے رنگ انہیں نئے خشم کی
ترغیب دلاتے، وہ آگے بڑھتے اور مسحور رچاتے۔

کر زنگ انہیں نئے جنم کی ترغیب دلاتے، وہ آگے بڑھتے
اور سوئمبر رچاتے تھے۔

اور میرے اجداد مجرد تھے، ان کے رختِ سفر میں
شہوت کا غلبہ تھا۔

میدانوں کے کمزور مکیں آخر مغلوب ہوئے، کھیتوں
کے کھیت اور رحموں کے رحم، باہر کی شریانوں سے
گرتے نطفوں سے لبریز ہوئے تھے؛ کالی چمڑی والے
راتوں کی آہٹ میں ہجرت کرتے دور بنوں میں بوڑھے
برگد کی چھاؤں سے لپٹ گئے تھے۔

کیا میرے اجداد بگولوں کے صحرا سے نمکین سمندر
میں بیڑے کھیتے کھیتے سنگلاخی ساحل پر اترے تھے؟
وہ چراغ حقیقت کا لائے تھے؟ یا بادِ مراد نے
ان کا رستہ بدل دیا تھا؟

کچھ پتہ نہیں ہے!

یہی سُنا ہے، ہر زمانے میں تاریخ کے نقطے، شوشے
اور قوسیں زمین کی گردش کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں،
اور عدمِ حقیقت بھی حقیقت بن جاتی ہے،

تاریخ کا رستہ بہت دھندلا ہے، اور میرے
پاؤں لہو میں بھیگ گئے ہیں،

ذہن ابھی تک کاذب اور عیار مورخ کی مانند
فقط سنی سنائی باتوں پر جیتا رہا ہے!

میں شہوت میں چھپ کے پہاڑوں اور صحراؤں
سے بنتے ذرّوں سے آیا تھا، پھر میرے بدن میں
نسلوں کا پیوند لگا تھا اور میں نے چتکبری چمڑی پہنی تھی۔
اب میں نیچے گرتی جدول کی شاخ پکڑ کر اوپر
کیسے آؤں؟ اپنے ماخذ کے درخت کا حلیہ دیکھوں، جس
پر سات فضاؤں اور سات زمانوں کی گرد اَٹی ہے۔
میں شاخ سے ٹوٹا پتہ کدھر کو جاؤں اور کہاں
سے معنی پاؤں؟ لوگ حرامی کہتے ہیں!
میں نے اپنی اولاد کا نطفہ روک لیا ہے، تاہم
عجلت میں باہر نکلی اولاد مرے اعلان کے در پے
ہے؛ وہ اپنے شجرے کی تیاری میں ہے، میں دو شجروں
کی جدول میں پیدائش کی پہلی رات سے سارے
کرّوں اور سارے جسموں کے گرد مسافر بن
کر بھٹک رہا ہوں!

۱۹۷۳

ایک عجیب سوچ

ہنسی خوشی میں
شہروں کی دلہن شہر لاہور میں آیا تھا
پچیس سال ہوئے!
گلی محلوں میں خوشیوں اور رزق کی خواہش تھی
لوگ مہاجر اور مقامی کا فرق مٹا کر راتوں رات
چلتا زر کمانے نکلے تھے،
ہر ایک نے عظمت، شہرت اور تمول کے پھول چُنے تھے
لیکن میں —
ایک ضعیف العقل کی مانند اس قہوہ خانے کی کھڑکی میں
اپنے آپ سے باتیں کرتا
پچیس سالوں سے ایک عجیب سوچ میں گُم ہوں!

۱۹۷۳

گدھ

ان دنوں
جب تہذیب ہمارے چہروں پر پاؤں کی ٹھوکر مارتی تھی
جب مقدس پانی ہماری جھکی ہوئی پیشانیوں پر
طمانچہ مارتا تھا
گدھوں نے اپنے پنجوں کے سائے میں
"سرپرستی" کی خون آلود یادگار بنائی تھی
ان دنوں
سڑکوں کے ملزاتی جسم پر درد بھرا قہقہہ تھا
اور دعائے قنوت کا بے رنگ آہنگ
نوآبادیاتی کثافت زادوں پر شور و غوغا کو دبا دیتا تھا
زبردستی لیے ہوئے بوسوں کی تلخ یادو!
بندوق کی نوک پر توڑے ہوئے غیر ملکیوں کے
وعدے
جو تمام کتابوں کا علم رکھتے تھے لیکن محبت کے معانی
سے ناآشنا تھے
لیکن ہم، جن کے ہاتھ دھرتی کی کوکھ کو زرخیز
بناتے ہیں

تمہارے فخریہ گیتوں کے باوجود
تار تار ہوئے افریقا کے ویران دیہاتوں
کے باوجود
امید ہمارے اندر اس طرح محفوظ تھی
جیسے قلعے میں ہو
اور "سوائنزی لینڈ" کی کانوں سے یوروپا
کی فیکٹریوں تک
بہار ہمارے روشن قدموں کے نیچے دوبارہ جنم
لے گی۔

(ڈیوڈ ڈائوپ —
سینیگال کا شاعر)

نحیف ممنوعہ رات

بے خواب راتوں کا مسافر ہوں
میری ہر رات میں بے چین راتوں کا تصادم ہے،
کبھی گذرے زمانے کے جھروکے سے تصور کے خنازئیں
مجھے عمرِ گریزاں کے سنہری زرد سے لرزتا
خوف آتا ہے،
کبھی اپنے زمانے کے تعصب تنگ نظروں کی جہالت
سفاکی،
اور،
عورتوں کی احمقانہ ازدواجی خواہشوں سے مضطرب
پھر رات سب بے خواب راتوں میں تسلسل
ڈھونڈتا ہوں
اور،
کبھی میں کائناتی سلسلوں میں موت کی تحریر کے
ہر لفظ میں
اس بدنصیبی کو اترتے دیکھتا ہوں۔
جو حیاتِ مختصر کا بھوت بن کر زندگی کی
آرزو کی سب رگوں کو کاٹتا ہے،

بے خواب راتوں کی پریشانی
مجھے سردانشی، مذہب، سیاست اور اپنی نسل کے گمنام ماضی کے
بہت ممنوعہ رستوں کی طرف لے جاتی ہے
کچھ آگے بڑھتا ہوں
مگر چاروں طرف سے سرزنش کے ہاتھ کا پھندہ
مری گردن کو آتا ہے
میں اپنے رزق کی خاطر نحیف و ناتواں کم عقل کی مانند
ہاتھوں سے لرزتا سر پکڑ کر بیٹھتا ہوں:
زندگی اک باولے کا قہقہہ ہے
رات کے پہلوؤں میں جگنو بنتا ہے
زلزلوں سے بچتے پاتال کی مانند ہر بے تاب ذہن کو یوں
غرق کرتا ہے
بدن سارا خلا کی تیرگی میں میلوں نیچے گرتا ہے
کہیں بھی زندگی اور موت کے اسرار میں
روزنِ نگاہِ شوق کا کھلتا نہیں ہے!

۱۹۷۳

فراق کا گیت

وہ کہہ رہی ہے:
کہ میرا شوہر دیارِ وحشت کے غم کدے میں
جلی تمازت کے سرخ زنداں میں یوں کھڑا ہے
کہ پھول بیلوں کے پاس کانٹوں پہ ٹھوڑی رکھ کر
افق پہ رنگوں کی آرزو میں ہوا کے جھونکوں میں جاگتا ہو
وہ گرم موسم کے قہر میں بھی
وہ سرد موسم کے زہر میں بھی
مری تمنا کا ہاتھ تھامے طلوعِ فردا کا منتظر ہے
کہ پاؤں اس کے دیارِ وحشت کی گرم مٹی سے جل چکے ہیں۔
بہت دنوں سے میں خواب میں ہوں
بہت دنوں سے میں اس کی بستی کے ایسے سے نکلتے سورج
کو دیکھتی ہوں
کہ اس کی دھڑکن زمیں کے سارے وجود میں ہے
میں روز کھڑکی سے پار جاتے ہوئے مسافر کو دیکھتی ہوں
میں آسماں پر جو بیکراں ہے
شفق پہ جو بے زباں ہے
میں موسموں میں ظہور ہوتی حقیقتوں کے شجر کے سائے کو دیکھتی
ہوں

ہواؤں کے ساتھ آئے ہوئے پرندوں کی ہجرتوں میں
اُس دیارِ وحشت میں استقامت کی داستاں ہے،
کیسے جگاؤں؟
کیسے پکاروں؟
فضا کے در پر، ضمیرِ عالم کے بند در پر،
میں دستکوں کی تھکن سے ٹوٹے بدن کو لے کر
کیسے بلاؤں؟
کیسے جگاؤں؟
کہ گھر کے آنگن کے پیڑ کی شاخ جھک گئی ہے

۱۹۷۳ء

انیس ناگی

سید آغا حیدر

"کچھ مصنف کے بارے میں"

انیس ناگی نام ہے ایک شخصیت کا، جس نے بغاوت کی ہے، ادب میں جمود کے خلاف، معاشرتی استحصال کے خلاف، اور ہر اُس قدر کے خلاف جو ادب اور سماج میں جمود پیدا کرتی ہے، اُس کی فنی شخصیت کا سب سے اہم پہلو اس کی انفرادیت ہے، اُس کی انفرادی سوچ اور فکر "شعری لسانیات" اور "بشارت کی رات" میں نمایاں ہے، بشارت کی رات مشرق و مغرب کے جدید شعری تجربات کو سمیٹے ہوئے ہے، اور شعری لسانیات اپنے موضوع کے اعتبار سے اردو شاعری کی پہلی تنقیدی دستاویز ہے جس میں شاعری کے لسانی ادراک اور تشکیلات کا جائزہ لیا گیا ہے، اردو ادب میں اس نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے

اسی طرح انیس ناگی کی پہلی تنقیدی کتاب "تنقید شعر" مبادیات شعر کی جدید تشریح کے منفرد حاشیے کی صورت رکھتی ہے۔ وہ نہ صرف نئی شاعری کی تحریک میں صفِ اوّل کے شاعروں میں سے ہے بلکہ نئی شاعری کی نظریاتی منصوبہ بندی اور اس کی تصوراتی تشریح میں اپنے ہمعصر نقادوں پر فوقیت رکھتا ہے نئی شاعری پر اس کی کتاب "نیا شعری افق" ایک دستور العمل کی حیثیت رکھتی ہے انیس ناگی ایک ایسا نقاد ہے جس نے شاعری کی تفصیلات اور اس فن کا بہت ہی تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

انیس ناگی نے ترجمہ کی دُنیا میں بھی اہم تجربات کئے ہیں، سینٹ جان پرس، راں بو اور دیگر مغربی شاعروں کے ترجمے کرنے کے بعد، حال میں اس نے جدید اردو شعراء کے ترجمے انگریزی میں کئے ہیں، اس کی یہ کاوش ہمارے ادب کو بین الاقوامی

سطح پر متعارف کروائے گی، اور دنیا کو ہمارے جدید شعری رجحانات سے واقفیت ہوگی، یہ کام کتنا کٹھن اور اس کا معیار کتنا بلند ہے، اس کا اندازہ اشاعت پر ہی ہو سکے گا۔ بہرحال یہ اردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہے۔

انیس ناگی کا پہلا شعری مجموعہ "بشارت کی رات" ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا اور دوسرا مجموعہ "غیر ممنوعہ نظموں" کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔ انیس کی شاعری موضوع کی گہرائی، جذباتی شدت، نفسیاتی ژرف نگاری کے اعتبار سے ہمعصر شعرا کی نسبت خصوصی لہجے کی حامل ہے، اس کے یہاں انسانی کرب کی انتہائی جذباتی تصاویر ملتی ہیں، زیرِ نظر مجموعہ پہلے شعری مجموعہ "بشارت کی رات" کی نسبت موضوعاتی اعتبار سے مختلف ہے، گذشتہ چند سالوں میں سیاسی صورت حال اور اقدار کی تبدیلی سے انیس متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا، چنانچہ زیرِ نظر نظموں میں بھی آشوب کی صورت اجتماعی رنگ اختیار کر گئی ہے۔ اور صیغہ واحد متکلم کا تواتر محض ایک استعارہ یا حوالہ ہے جس کے توسط سے تجربے کی تسکین ہوتی ہے، ان نظموں میں جذباتی واردات کے ساتھ ساتھ حیات و کائنات اور انسانی معاملات کے بارے میں ایک مخصوص رویہ بھی ملتا ہے، اور یہ رویہ بالعموم ہر چیز کے المیئے اور انسانی بے بسی پر منتج ہوتا ہے۔

زبان و بیان کے اعتبار سے انیس ناگی کی نظموں کی فنی تعمیر کا اسلوب غیر روایتی ہے اس کا لہجہ، کھردرا، تشدد آمیز اور چونکا دینے والا ہے اور یہ خصوصیات ایک اس کا اپنا خصوصی لسانی اسلوب وضع کرتی ہیں وہ ان معدودے چند نئے شعرا میں سے ایک ہے جنہوں نے آزاد نظم کی فنی حیثیت کی طرف خاطر خواہ توجہ دی ہے۔

انیس ناگی کی تخلیقی کاوشوں کا مرکز محض شعر و سخن اور تنقید شعر ہی نہیں ہے اس نے نذیر احمد کی ناول نگاری پر ایک کتاب لکھ کر پڑھنے والے کے سامنے بے شمار نئی جہتیں پیش کر دی ہیں۔ اس کتاب میں پہلی بار کسی کلاسیکی ناول کا اس عہد کے معاشرتی و ثقافتی حوالے سے تجزیہ کیا گیا ہے، انہوں نے نذیر احمد پر بندھے ٹکے تنقیدی تصورات کو توڑ کر تنقید کے نئے

افق سے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ ہمیں اس روشنی میں پہلی بار کردار اصل شکل میں نظر آتے ہیں اور روایتی نقادوں کی لگائی ہوئی تعصبات کی عینکوں کے شیشے چٹخ جاتے ہیں اور پھر ان عینکوں کو اُتار دیں تو نذیر احمد کے کردار کی اصل صورتیں اور ان کے چہروں کے اصل رنگ روپ نظر آنے لگتے ہیں۔ ابن الوقت جو ہم میں سب سے معتوب کردار تھا، انیس نے اسے نئی ملنے والی آگاہی اور ذات کے پُرانے قول سے نکلنے کی علامت قرار دے کر اُردو ناول میں ایک نئی تعبیر پیش کی ہے۔

انیس ناگی نے ٹی۔وی کے لئے بھی کچھ ڈرامے لکھے ہیں یہ ڈرامے ماضی حال اور مستقبل کی کشمکش، قدروں کی ٹوٹ پھوٹ، انسان کے بنیادی مسائل اور ان سب سے اپنی تسخیر شدہ ذات کے حصار کو نکلنے کی کوشش نمایاں ہے، اس کا ناول "دیوار کے پیچھے" ابھی شائع نہیں ہوا۔ لیکن اس میں بھی اس عہد کی ریاکاری، دوغلا پن اور اور جھوٹی روایتوں کی شکست و ریخت کی گئی ہے۔ انیس ناگی کے قلم نے اس دور کے منافق کرداروں اور جھوٹی قدروں کی نشاندہی کی ہے اس کی اشاعت اردو ادب پر گہرا سماجی اثر چھوڑے گی۔

ان تمام تخلیقات میں پڑھنے والے کے ذہن کو جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے، وہ اس کا انفرادی تخلیقی جوہر ہے وہ اپنے ہمعصروں میں بھی اس تیکھے انفرادی جوہر کی بدولت ممتاز اور الگ ہے وہ جدید شعراء کی تحریک میں بھی شریک ہی رہا۔ لیکن اُس کے پیر مضبوطی سے اپنے اصولوں پر ہی جمے رہے اس کے ارد گرد ہونے والی نہایت تند و تیز تبدیلیوں نے اسے کچھ عرصہ سوچنے پر تو مجبور کر دیا لیکن وہ اپنے بنیادی اصولوں سے پیچھے نہ ہٹا، یہی اس کی گہری انفرادی صلاحیت ہے۔ جس نے اس کا ادبی مرتبہ اپنے ہمعصر شعرا اور نقادوں سے بلند رکھا ہے، اور انیس کی تمام تنقیدی و شعری کاوشیں بلاشبہ اردو ادب کا گراں مایہ سرمایہ ہیں۔
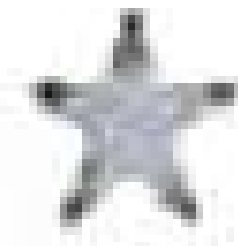
سید آغا حیدر

انیس ناگی کی کتابیں

★

- بشارت کی رات (نظمیں)
- شعری لسانیات (علم المعانی)
- نیا شعری افق (نئی شاعری کی تنقید)
- تنقید شعر (مبادیات شعر)
- نذیر احمد کی ناول نگاری (تنقید)
- سجرے پھل (انتخاب جدید پنجابی شاعری)
- جہنم میں ایک موسم (راں بو) (ترجمہ)
- ہوائیں (سینٹ جان پرس) (ترجمہ) (زیر اشاعت)
- پرندے اور دوسری نظمیں (سینٹ جان پرس) (ترجمہ) (زیر اشاعت)
- دیوار کے پیچھے (ناول) (زیر اشاعت)
- **Modern Urdu Poems From Pakistan**
(انتخاب : نئی اُردو شاعری کا انگ

ELLAHI ART PRESS, LAHORE.